کلاسیکیت، جدیدیت اور معاصر افسانہ

انوار احمد

Abstract

This essay divides trends in urdu short story in to three different time periods. Classical urdu Short Story period discussed internal and external influences on fabric of short story. After partition, writer's behavior of acceptance and rejection has been discussed. At the end discussion revolves around the contemporary short story and how it reflects contemporary issue.

منشا یاد، اشفاق احمد، قرۃ العین حیدر، بانو قدسیہ، عبداللہ حسین اور انتظار حسین کی وفات کے باوجود، اردو افسانہ اتنا سخت جان ہے کہ اسے لوگوں کی چوپال تک پہنچانے والے موضوعات، اشرافیہ کی چوکھٹ سے باہر پاؤں دھر سکنے والے رسائل اور تخلیقی ضمیر کو للکار بنانے والی فکری تحریکوں کی گمشدگی کے باوجود لکھا جا رہا ہے، خالدہ حسین کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ، جینے کی پابندی، لذت مطالعہ کی دعوت دیتا ہے، جس کے ایک افسانے ''موہنجودوڑو'' کے اختتام پر وہ کمال سادگی سے کہتی ہے 'مگر آپ کو یہ واقعہ کسی اور سے بھی سننا چاہیے، معلوم نہیں میں نے کیا دیکھا، سنا'، (۱) حسن منظر اپنے تازہ ترین مجموعے ''جھجک'' میں جہاں یہ ذکر کرتا ہے۔ ان گنت آدمیوں کے دماغوں پر کوئی نہ کوئی عفریت پہرہ دے رہا ہے، وہاں سب تشدد پسندوں کو یاد دلاتا ہے کہ چنگیز خان ساری عمر جنگ جوئی میں بتانے کے بعد آخر دنوں میں ڈپریشن کا شکار ہو کر رہ گیا تھا، نہ کھاتا تھا، نہ پیتا تھا، نہ سو سکتا تھا، معلوم نہیں خواب میں کیا دیکھتا ہوگا'، اسی طرح اصغر ندیم سید کے مجموعے 'کہانی مجھے ملی' کی ورق گردانی کی تو 'ایک اور ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کی اختتامی سطروں نے برصغیر کے حکمرانوں کے در پر کھڑی سوالی تاریخ نے ایک زہر خند کے ساتھ اپنا کاسہ الٹا دیا' مجھے محسوس ہوا کہ میں نے خوشونت سنگھ کی راکھ مٹی کی ڈولی میں ہڈالی ضلع سرگودھا پہنچا دی ہے، یہ راکھ کبھی ادھر سے اور کبھی ادھر سے آتی ہے۔ مگر زیادہ سالوں سے نہیں۔ بس آخری ایک آدھ پاگل سردار باقی بچ گیا ہوگا' (2) نامور نقاد ناصر عباس نیر کے دو افسانوی مجموعے آ چکے ہیں۔ اسی برس نئے افسانوی مجموعے کی نوید وہ فیس بک پر دے چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ابھی وہ میری دسترس میں نہیں۔ مگر ان کے دوسرے افسانوی مجموعے 'فرشتہ نہیں آیا' کے ایک افسانے سے چند سطریں دیکھئے آدمی ایک لفظ سے جان چھڑاتا ہے تو ایک نیا لفظ آن وارد ہوتا ہے۔ ایک خیال سے خلاصی چاہتا ہے تو دوسرا خیال آن دھمکتا ہے۔ ایک عورت سے طبیعت گھبراتی ہے تو دوسری عورت کی طرف توجہ جاتی ہے۔ پھر اس سے بھی طبیعت اوبھنے لگتی ہے۔ یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ غرض نئے پرانے بہت سے لوگ افسانہ لکھ رہے ہیں۔ رضیہ فصیح احمد کا نیا

افسانوی مجموعہ 'خوابوں کا جزیرہ' شائع ہوا ہے۔ نجم الدین احمد کا 'فرار' سائرہ اقبال کا 'مکمل کچھ نہیں ہوتا' جمیل عثمان کا 'روشنی کے درخت' اور دوسرے ایک درجن سے زائد افسانوی مجموعے۔ اسی طرح جرائد دیکھیں تو رشید امجد، مسعود اشعر' اکرام اللہ برابر لکھ رہے ہیں۔ اور تو اور مستنصر حسین تارڑ کی ابھی تین کتب شائع ہوئی ہیں۔ 'لاہور آوارگی'، 'پیار کا پہلا پنجاب' اور 'حراموش، ناقابل فراموش' یہ تو اس کی صوابدید ہے کہ وہ انہیں افسانے کہے تو ہم یہی ثابت کریں گے۔ میں ملتان سے ایک رسالہ 'پیلوں' شائع کرتا ہوں۔ اس کے افسانہ نمبر کے لیے میں نے افسانہ مانگا تو انہوں نے بھیجا اور ہم نے بھی اسے افسانہ سمجھ کے شائع کیا مگر بعد میں ان کے سندھ سے متعلق داخلی سفرنامے کے ایک باب کے طور پر اسے پایا۔ مگر مجھے بار بار اسد محمد خان کا ایک انتباہ یاد آتا ہے: ''تخلیق کار کی خلاق کی مہلت لامحدود نہیں ہوتی۔ اہم ترقی پذیر بلکہ پچھڑے ہوئے ملکوں کے تخلیق کاروں کی مہلت کی اس تلوار سے تیز اور 'بال سے باریک' دھار پر سے اپنا کچھ اثاثہ بناتے ہوئے گزرنا ہوگا۔ ورنہ پچھلی صدی کے کتنے promising بلکہ دھواں دھار رفتار سے چلنے والے شاعر اور لکھک شعلہ مستعجل کی طرح بجھے یا کسمپرسی میں ختم ہوئے''۔

اردو افسانے نے سیاسی غلامی، معاشرتی پسماندگی اور ذہنی و جذباتی زلزلوں سے معمور دنیا میں آنکھ کھولی، یوں اپنے آغاز میں ہی یہ اپنے لب و لہجے، طرز احساس اور تدبیر کاری کے اعتبار سے دو واضح منطقوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک منطقہ رومان کا تھا۔ جہاں خواب و خیال اپنی رنگینیاں اور شیرینیاں بانٹتے دکھائی دیتے ہیں یہاں فرد اپنی ذہنی و جذباتی آزادی اور فطری مسرت کی حفاظت کے لئے کوشاں دکھائی دیتا ہے۔ جو حقیقی دنیا میں پارہ پارہ ہورہی تھی اس دائرے میں ماورائیت، جنسی و نفسیاتی شعور کی لپک اور انفرادیت کا زعم گونجتا دکھائی دیتا ہے۔ جبکہ دوسرے منطقے میں بے بسی اور مجبوری کسمساہٹ اور تلملاہٹ کو پروان چڑھا رہی تھی۔ نوآبادیاتی نظام سے نفرت، اس کی آلہ کار قوتوں، اداروں اور کارکنوں سے بیزاری، غلامی، غربت، محرومی اور جہالت کو تقدیر انسانی جاننے پر آمادگی سے گریز اور ماضی سے بے تعلقی، غراہٹ سے مشابہ لب و لہجے کو پروان چڑھا رہی تھی۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک ہی سیاسی، سماجی منظر کا عکس ہے، اضطراب اور انحراف ان دونوں منطقوں میں باطنی وحدت پیدا کرتا ہے، ایک جگہ مرتعش جذبات دبک کر نفسی تسکین فراہم کر رہے ہیں تو دوسری جگہ سیدھے سبھاؤ غلامی، جہالت اور محرومی کی مستبد طاقت کے خلاف جنگ کا عزم، نقارے پر چوٹ لگا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رومانوی افسانہ نگاروں کا سرخیل یلدرم حریت پسند ترکوں سے اپنے رشتے کا برملا اعلان کرتا ہے۔ مولوی نذیر احمد کی سخت گیر اخلاقیات کا وارث راشد الخیری اس مولویت کے خلاف بھرپور جہاد کرتا ہے جو سادہ لوحی کو بیڑیاں پہنائے جارہی تھی اور پریم چند روح عصر سے یوں مکالمہ کرتا ہے کہ مثالیت پسندی اور جذباتیت سے گزر کر سماجی واقعیت نگاری اور رقت کے غلبے سے آزاد حقیقت نگاری کی دشوار گزار گھاٹی میں جا اترتا ہے۔ اس دور میں مغرب کے خلاف مزاحمت کا ایک اور رنگ بھی ہے۔ جسے مسلم رنگ کہا جا سکتا ہے۔ ایک تو تہذیبی سطح پر جیسے سلطان حیدر جوش اور راشد الخیری 'مغرب زدگی' کے خلاف بند باندھتے دکھائی دیتے ہیں اور دوسرے سیاسی سطح پر، جیسے یلدرم انگریزوں کے خلاف صف آرا ترکوں سے جذباتی و

ذہنی اشتراک محسوس کر رہے تھے اور راشد الخیری اطالیہ کے مسلمانوں پر مغربی سامراجیوں کی مسلط جنگ کے خلاف ردعمل ظاہر کر رہے تھے۔

بیسویں صدی میں پہلا بڑا سیاسی سانحہ، جس نے اردو افسانے کو بے حد متاثر کیا۔ وہ جلیانوالہ باغ کا سانحہ (۱۹۱۹ء) ہے تو آبادیاتی طاقت نے جس طرح شائستگی اور تہذیب کے خول کو توڑ کے اپنا حقیقی چہرہ دکھایا تھا اس نے تعلیم یافتہ طبقے کی خوش فہمی کسی حد تک دور کر دی جو مغربی دنیا کے ضمیر کو اپنا سیاسی آزادی کے لئے بہت بڑا آسرا جانتا تھا۔ اس سانحے نے منٹو (تماشا) غلام عباس (رینگنے والے) اور دوسرے افسانہ نگاروں سے تو افسانے تخلیق کرائے ہی، راشد الخیری تک نے اس جبر کے خلاف 'سیاہ داغ' ایسا افسانہ تخلیق کیا۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں افسانہ نگاروں کا رویہ میر کے اس مصرع کے مصداق رہا:

اک آگ میرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

''انگارے''، 'آتش پارے'، 'شعلے'، 'الاؤ' اور 'چنگاریاں' اس دور میں شائع ہونے والے بعض افسانوی مجموعوں کے نام ہیں۔ اس دور میں سیاسی جبریت کے ساتھ ساتھ وحشت بھری تاریخ بھی ہمیں بتاتی ہے کہ آمر مطلق، سرمایہ دار اور مذہبی پیشوا کے مفادات کے اشتراک انہیں اس حد تک قریب لے آتے ہیں کہ ظلم کی چکی میں پسنے والوں کو ان کا ایک ہی چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ ہماری شعری روایت میں بھی اہل شریعت اور اہل طریقت کی 'لاگ' اکثر تصادم کا رنگ اختیار کرتی ہے، مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ معتقدات و معاملات میں عدم توازن کا ردِعمل تھا جو رفتہ رفتہ معاملات انسانی کی پاس داری سے محروم ہو کر 'معاملہ بندی' کی نذر ہو گیا۔ اس لئے 'انگارے' کے وہ افسانے جن میں کھلم کھلا خدا تعالیٰ کے وجود کی تضحیک کی گئی ہے۔ فرشتوں کے تصور اور حیات بعد الموت کے عقیدے پر پھبتیاں کسی گئی ہیں روشن خیالی کی دلیلیں نہیں بلکہ محض ردعمل کے مظہر ہیں۔

اردو افسانے کے مطالعے نے اکثر مجھے ایک سوال پر خوب الجھایا ہے وہ یہ کہ وہ کینوس جس پر سیاسی ارتعاش کی ہر لہر کا نقش ابھرا ہے تحریک پاکستان کا مظہر کیوں نہ بن سکا؟ بلاشبہ ایسے افسانے ضرور لکھے گئے، جن میں تحریک خلافت کے حوالے سے جداگانہ مسلم شخصیت کا احساس ابھرتا ہے یا کہیں کہیں قائداعظم یا مسلم لیگ کا سرکاری حوالہ بھی آیا ہے (قیام پاکستان کے بعد تو بہت سے افسانے تحریک پاکستان سے متعلق لکھے گئے۔ جو تحریک پر —' کلیم' کا اعتبار بڑھانے کی عملی کوششوں کا حصہ دکھائی دیتے ہیں) مگر کروڑوں مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن اردو افسانے میں کیوں نہ سنائی دی؟ اور کیوں مطالبۂ پاکستان پاکستان پر برہمی اور آزردگی کا احساس ہی ابھرا؟ تاریخی شعور سے اپنی کومٹ منٹ رکھنے والے افسانہ نگاروں کے ہاں قیام پاکستان اچانک ابھرنے والے ایک 'سانحے' کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ میرے خیال میں اس کے حسب ذیل اسباب ہیں۔

۱۔ بیسویں صدی کے تیسرے چوتھے عشرے میں اردو افسانے کی توانا ترین آواز ترقی پسند ادبی تحریک کی ہے

جس سے وابستہ بیشتر تخلیق کاروں نے یا تو دیانت داری سے محسوس کیا کہ مطالبۂ پاکستان انگریزوں کی ''لڑاؤ اور اقتدار بڑھاؤ'' کی پالیسی کا کرشمہ ہے یا پھر وہ کانگریس کے ثقافتی ونگ کے زیرِ اثر تھے۔

۲۔ دینی احساس پر مبنی جداگانہ قومی شخصیت کی طلب، روشن خیالی اور انسان دوستی سے متصادم خیال کی جانے لگی۔

۳۔ مسلم لیگ نے بلاشبہ ۱۹۴۰ء میں پاکستان کا مطالبہ کیا تھا مگر مسلم اکثریتی صوبوں کا جوش و خروش مسلم اکثریتی صوبوں میں بہت دیر سے پہنچا ۱۹۲۶ء کے انتخابات کے بعد ہی پاکستان کی منزل قریب آئی اور حالات میں تیزی سے تبدیلی آئی اور ہمارے بہت سے دانشوروں کے تجزیے دھرے رہ گئے۔

۴۔ مسلم لیگ نے ثقافتی اور ادبی محاذ پر کام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

۵۔ فسادات اور متوقع نقل مکانی کے امکان نے بھی بہت سے حساس ادیبوں کو آزردہ کر دیا تھا۔

۶۔ بعض مسلمان افسانہ نگار بمبئی کی فلمی یا صحافتی دنیا دلّی کے ریڈیو اسٹیشن یا ایسے کسی ثقافتی ادارے میں ملازم ہو کر نہ صرف معاشرتی آسودگی کی چاپ سن رہے تھے بلکہ ان کی تخلیق سرگرمیاں ایک وسیع حلقے میں قبولیت بھی پا رہی تھیں۔ سو وہ جذباتی طور پر اس حقیقت کو قبول کرنے سے گریزاں تھے۔

۷۔ کانگریس کے مددگار برلا اور ٹاٹا تو قوم پرستی یا اپنی سرمایہ دارانہ ذہنیت کی بدولت پس پردہ رہ کر متوقع مالی مفادات کے لئے سیاسی سرمایہ کاری، کر رہے تھے۔ مگر مسلم کے محاذ پر بیشتر جاگیردار اپنی ذات کے جذبے سے مجبور ہو کر ضرورت سے زیادہ نمایاں ہو رہے تھے۔ جس سے بعض ادیبوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پاکستان میں جاگیرداروں کی ہی حکومت ہوگی۔ ہندوستان میں دو مسلم اکثریتی صوبوں میں سے ایک، پنجاب میں قیام پاکستان سے پہلے یونینسٹ پارٹی حکمران رہی، جو مفاد پرست اور جاگیرداروں زمیندار اور پیروں، مخدوموں کی جماعت تھی بعد میں ہر قیمت پر منافع چاہنے والے تاجر اس میں شامل ہوگئے۔

بہر طور قیامِ پاکستان کے بعد اردو افسانے کے افق پر فسادات کا لہو رنگ گرد و غبار ایک عرصے تک چھایا رہا اس موضوع پر لکھے جانے والے افسانوں کو چار گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ایسے افسانے جن میں 'قومی نقطۂ نظر' سے مخالف قوم کی ستم رانی کی جذباتی روداد بیان کی گئی۔

۲۔ ایسے افسانے جن میں کلبیت اور تلخی سے اعلان کیا گیا کہ سرحد کے دونوں طرف انسان مر گیا ہے اور وہ تمام ذہنی اور جذباتی آسرے بھی ختم ہو گئے جو امکانی حادثوں کے خلاف اسے تحفظ فراہم کرتے تھے۔

۳۔ تلخی، نفرت، کدورت اور تعصب کے ماحول میں امید پرست نقطۂ نظر کو تقویت دینے والے افسانے بھی لکھے گئے، جنہیں ترقی پسند تحریک کے مخالفوں نے فارمولا افسانہ کہا۔

۴۔ اخلاقی اور تہذیبی تعطل کے وقفے میں انسانی فطرت کی معنویت کو متعین کرنے والے افسانے بھی لکھے گئے۔

دوسرے زمرے میں ہی ایسے افسانے بھی شامل ہو گئے جن میں سرحد پار آنے والوں سے اپنوں کے ہی غیر انسانی رویے کو موضوع بنایا گیا اس میں ماہر کیمپوں میں منتظمین کی ہوشیاری اور بے حسی کے ساتھ ساتھ حرص زرا

اور خود غرضی کے مناظر کے بھی شامل ہیں جنہوں نے بالعموم شکستِ توقعات کے سوگوار رنگ کو نمایاں کیا۔ قیام پاکستان سے پہلے بھی بھوک کے اذیت ناک بوجھ تلے کلبلاتے بنیادی انسانی رشتوں اور جذبوں کو موضوع بنایا گیا تھا (خاص طور پر 'قحط بنگال') اور قیام پاکستان کے ابتدائی برسوں میں ان مہاجر کیمپوں میں اس موضوع کو اتنی بے دردی سے دہرایا گیا کہ اگر کوئی نظام کے تسلسل کے سبب یہ نتیجہ اخذ کر لے کہ غلامی اور آزادی میں کوئی زیادہ فرق نہیں، تو شاید یہ اتنا بڑا مغالطہ نہ دکھائی دے۔ ماجرا یہ ہے کہ جنگِ عظیم دوم کے بعد سامراجی ذہن نے مذہبی حربے اختیار کئے۔ امداد دینے والے ادارے قائم کئے۔ بھوکے اور غیر مہذب لوگوں کو زندگی کی اذیت سے نجات دلانے کے لئے ہلاکت خیز ہتھیار 'آسان شرائط' پر فراہم کئے، اپنے مفادات کو تقویت دینے والے سیاسی، سماجی نظام بھی چھوٹے ممالک ('دوست' ممالک) کو تحفے میں دئے بسا اوقات تو 'حکمران' بھی عطا کئے یوں تیسری دنیا کے نو آزاد ممالک میں سیاسی آزادی ایک واہمہ بن کر رہ گئی، دوسرا المیہ یہ رونما ہوا کہ مطلوبہ تعلیمی سرگرمی (فکری و ذہنی پس منظر کو روشن بنانے کے لئے) کے بغیر ضعیف الاعتقادی، جہالت، توہم اور پسماندگی کے اندھیرے میں بھٹکتے نو آزاد ممالک میں ان سپر پاورز نے اپنے مفادات سے ہم آہنگ صنعتی نظام اور مارکیٹ اکانومی قائم کرنے کی آزادانہ اور فراخ دلانہ کوشش کی۔ یوں صنعتی نظام کی تمام تر برائیاں تو ہمارے معاشرے میں پیدا ہوئیں۔ مگر سرمایہ دارانہ نظام کی بعض سہولتوں اور نعمتوں سے بیشتر لوگوں کا تعارف نہ ہو سکا۔ اس طرح ان بڑی طاقتوں کی سرپرستی میں ایک ایسا طبقہ پروان چڑھا جس کے پاس دولت ہی نہیں وافر سیاسی قوت بھی تھی۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد بھی افسانے نے تلخی اور تلملاہٹ کا لہجہ تبدیل نہ کیا بلکہ ملال اور افسردگی کا اضافہ ہو گیا۔

اردو افسانہ میں فسادات کے ساتھ ساتھ 'ہجرت' کا موضوع بھی ایک آسیب کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ یہ محض ماضی سے متعلق ایک جذباتی رویے کا عکس رہا اور نہ ہی یہ بچھڑنے والے تہواروں، گلی کوچوں، باغوں پرندوں اور لوگوں کی کشش میں اسیر رہنے کا ایک کرشمہ رہا، بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ایک پیچیدہ نفسیاتی رجحان بنتا گیا اور یہ بھی کہ نئے ماحول سے تہذیبی و ثقافتی موانست پیدا نہ ہو سکنے کے نفسیاتی اسباب بھی ہوں گے مگر اس کی وجوہات سیاسی اور معاشی زیادہ ہیں۔ بدقسمتی سے ہر حکمران پاکستان کو اس وعدے سے دور کرتا گیا کہ آزاد لوگوں کی شاداب سرزمین ہوگی، جہاں اکثریتی عقیدے کے مطابق ہر طرح کے استحصال سے آزاد معاشرہ اور منصفانہ و عادلانہ سماجی نظام قائم ہوگا۔ وسائل دولت پر کسی ایک فرد یا طبقے کا اجارہ نہیں ہوگا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان مستحکم اور ناقابل تسخیر ہوگا، تاکہ جن پنڈتوں نے ایک عشرے کے اندر اندر اس کے تحلیل ہو جانے کی پیش گوئی کر رکھی تھی اور انہیں سرخروئی نصیب نہ ہو، مگر ہوا یہ کہ پاکستان ابھی تک غیر یقینی حالات سے باہر نہیں آ سکا، پھر المیہ مشرقی پاکستان، سندھ، بلوچستان سرائیکی علاقے اور سرحد میں احساس محرومی، اگر 'ہجرت' کے مسئلے کو اور پیچیدہ اور تہہ دار بنا دے تو قابلِ فہم ہے اور یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جس انتظار حسین نے ۱۹۵۹ء میں لکھا تھا۔ ''اگر پاکستان کا افسانہ نگار سن ستاون، معرکہ کربلا اور جنگ بدر سے اپنا رشتہ جوڑے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس قوم کا جو نیا احساس تعمیر ہو رہا

ہے اس میں وہ ایک ہزار سالہ ہند اسلامی تجربہ کو اور پونے چودہ سو سالہ تاریخی شعور کو بھی شامل کرنے کے لئے کوشاں ہے۔'' اور جس نے 'آخری آدمی' اور 'شہر افسوس' کے افسانوں میں اسلامی دیو مالا کو تشکیل دینے کی کوشش کی؟ کس طرح اور کیوں افسردگی کے عالم میں ویران ہو کر ویدک دور میں اتر ا کلیلہ و دمنہ کی کہانیاں لکھیں اور کیوں ان دونوں گیدڑوں کو بھی ہٹ لسٹ پر دیکھا اور اب برصغیر میں ایٹم بم کے پش بٹن پر ہاتھ رکھے جلادوں کی کایا کلپ کی آرزو شہرزاد سے رکھتا ہے۔

ہمارے ہاں اس صدی کے پانچویں اور چھٹے عشرے میں 'عرفانِ ذات' کا چرچا بہت ہوا نفسیاتی شعور افسانے کے لئے اجنبی نہیں۔ احمد علی، حسن عسکری، منٹو اور ممتاز مفتی قیام پاکستان سے بھی پہلے اس موضوع پر افسانے لکھ چکے تھے مگر جدیدیت اس رویے میں ظاہر ہوئی کہ اپنی ذات کا کھوج لگایا جائے۔ انتظار حسین نے اپنے مخصوص انداز میں کہا'' ظاہر کا معاملہ تو یہ ہے کہ تھوڑے سے سماجی شعور ہی سے کام چل جاتا ہے مگر باطن ایسی نامراد چیز ہے کہ درونِ خانہ ہنگاموں کا علم خود صاحب خانہ کو بہت مشکل ہوتا ہے۔'' جبکہ میرا خیال ہے کہ یہ بھی ناکافی سماجی شعور کا نتیجہ ہے کہ انسان سنگین ٹھوس اور حقیقی اجتماعی مسائل سے خوف زدہ ہو کر واہمے کی دنیا میں الجھ جائے، جبلتوں کی لذتوں کو ہم رقص بنائے، نیوراتی اور اعصاب زدہ شخص کی نظر سے جو کچھ دیکھے، اسے حیات کی بنیادی صداقت خیال کرے دو عظیم جنگوں کے نتیجے میں یورپ میں جمع ہونے والے جذباتی وحسی ملبے (کیمیائی فضلے) کو اپنے ہاں ذخیرہ کرے، بہر طور پر یہ بھی ایک طرح کا ردعمل تھا، حقیقت کے ایک مظہر پر اکتفا کرنے کا، اجتماعیت، مقصدیت اور عقلیت پر زور دینے کا اور سب سے بڑھ کر یہ شخصی آمرانہ نظام کا، جہاں ادیب کو احساس دلایا جاتا ہے ریاست اور حکومت ایک ہی شے کے دو نام ہیں اور بتہ سے موضوعات پر اسے سوچنے اور کڑھنے کی زحمت سے بچانے کی خاطر تادیبی اقدامات کر لیے جاتے ہیں۔ اس لئے ہمارے ہاں باضمیر ادیب کے لئے علامت کا پیچیدہ نظام، جذباتی گھٹن کے تزکئے کا وسیلہ ثابت ہوتا ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے بھی ہمارا معاشرہ دو الگ الگ خطوں میں ہی نہیں تہذیبی رویوں میں سانس لیتا تھا۔ دیہی اور شہری آزادی سے پہلے پریم چند نے دیہی معاشرت کو بطور خاص مشاہدے کا مرکز بنایا۔ آزادی کے بعد پاکستان میں احمد ندیم قاسمی، غلام الثقلین نقوی، طاہرہ اقبال اور ذکا الرحمٰن نے دیہی اور مضافاتی کلچر کے نقش افسانے کے کینوس پر ابھارے، اس سلسلے میں افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے دو رنگ ہیں، ایک تو رومانی عینک سے دکھایا گیا جب کہ دوسرے میں عدم مساوات، محرومی، جہالت اور استحصال کی بدصورت نمایاں ہے اس میں شک نہیں کہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد سیاسی قوت کا اجارہ پنجاب کے زمینداروں اور جاگیرداروں، سندھ کے وڈیروں، سرحد کے خوانین اور کبھی بلوچستان کے سرداروں کے ہاتھ میں رہا۔ ان کی اپنی قوت کا اسرار تقاضا کرتا تھا کہ کبھی ثقافت کے نام پر، کبھی روایت کے نام پر اور کبھی عقیدت کے نام پر اپنی رعایا کو پسماندہ جاہل اور جہالت پر راضی رکھا جائے چنانچہ آزادی کے بعد بھی ہماری دیہی زندگی کو خاطر خواہ سہولتیں میسر نہ آسکیں اور اس طرح آج

جب کہ ہم فخر یہ کہتے ہیں کہ فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور ایک بین الاقوامی کلچر وجود میں آ چکا ہے تبھی ہمارے ہاں شہر اور دیہات دو الگ الگ دنیاؤں کا نقشہ پیش کرتے ہیں اور اردو افسانے نے ہمیشہ اس صداقت کی شہادت دی ہے۔ پاکستان میں قائم نا منصفانہ نظام نے جس طرح کی بے بسی، فکری انتشار اور جذباتی الجھاؤ کو پیدا کیا ہے۔ ہمارا افسانہ ایک عشرے تک اس کا مرقع بنا رہا۔ تاہم اس سلسلے میں افسانوں میں تین طرح کا 'پاکستانی' پیش ہوا:

1۔ نفرت، حقارت اور بیزاری کی پوری قوت سے اشیاء کو مسلنے، تصورات کو پاش پاش کرنے اور اجتماعی مقاصد کو مسترد کرنے میں مصروف، 2۔ سنگین حقائق سے خوف زدہ ہو کر وحشی رنگوں کا فریب بننے میں منہمک، 3۔ ظلم، استحصال اور جہالت کے خلاف جدوجہد کرنے میں مشغول۔ اور یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ ہمارے ہاں پہلے دو رویوں کو ''جدیدیت حسیت'' خیال کرنے والے افسانہ نگار بھی آمرانہ دور میں عدل، سچائی اور امید کا دامن تھام کر استحصالی قوتوں کے مقابل صف آراء ہو گئے مگر اس مزاحمت کی بھی دو سطحیں ہیں، ایک پر تو ترقی پسندی کا کتابی تصور رکھنے والے افسانہ نگاروں کی تخلیقی کاوشیں ہیں جو انفرادی اور اجتماعی تشخص کی گمشدگی، جبر و تشدد، اظہار کا مسدود راستوں، اخلاقی و تہذیبی انتشار اور غیر یقینی حالات کے پیش نظر یہ ''تاریخی'' رویہ اختیار کرتے ہیں کہ ان تضادات کو اور نمایاں کیا جائے زوال کے ''اسباب'' کو تقویت دی جائے تا کہ انقلاب کی صبح طلوع ہو سکے، جب کہ دوسرے افسانہ نگار یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی مغربی سماج کی افسردگی اور آزردگی کے اسباب پر نظر رکھی جا سکے، اس امر کی احتیاط کی جائے کہ پاکستانی معاشرہ اس تمدن اور تہذیبی انجام تک نہ پہنچے، اس سلسلے میں یہ افسانہ نگار عدل، حسن اور محبت سے منسلک اقدار کی ایجابی قوت کی مدد سے مزاحمت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

پاکستان میں عوامی سطح پر کئی تحریکیں بھی چلی ہیں۔ دو کی قیادت ملاؤں کے ہاتھ میں تھی اور دو کی نوعیت نیم سیاسی تھی جو ایوب خان اور ذوالفقار علی بھٹو کی اقتدار سے علیحدگی پر منتج ہوئیں، اس کے علاوہ لسانی معاملات سے متعلق مشرقی پاکستان اور سندھ میں بھی اضطراب نے طوفان کی شکل اختیار کی اور سب سے بڑھ کر ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں نے پوری پاکستانی قوم کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ پہلی دو تحریکوں سے عام طور پر ہمارے افسانہ نگار نے بے تعلقی اختیار کی، البتہ انتظار حسین کے ایک افسانے، ہندوستان سے ایک خط، میں احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کے سرکاری فیصلے کا ذکر موجود ہے۔ البتہ دونوں نتیجہ خیز عوامی ایجی ٹیشن اور ان کے نتائج افسانہ نگار کو بے تعلق نہیں رکھ سکے۔ انتظار حسین اور رشدی امجد کے ہاں تو خیر اس موضوع سے متعلق کئی افسانے مل جاتے ہیں۔ انور سجاد کے رویے میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی، یہ اور بات ہے کہ ان افسانوں میں ان تحریکوں کی ظاہر فضا کا رنگ رچا ہوا ہے۔ ان تحریکوں کے بین الاقوامی محرکات اور محلاتی سازشوں کی بھنک جس طرح عوام کو نہیں پڑی، اسی طرح افسانہ نگار بھی معروضی زاویہ نظر سے صورت حال کا مطالعہ کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ کچھ یہی عالم جنگ ستمبر 1965ء میں ہمارے افسانہ نگار کا رہا۔

اس وقت تین طرح کے افسانے لکھے گئے:

1۔ پاکستانی عوام اور افواج کا مورال بلند کرنے والے افسانے۔(الف) تو ہمات کو اجتماعی لاشعور کا نام دے کر غیبی امداد پر زور دینے والے، (ب) فرد کے فیصلے، ارادے اور ہمت کو بنیادی اہمیت دینے والے۔2۔ پاکستان کے طبقے کا شوقِ فتوحات اور بھارت کے توسیع پسندانہ عزائم کی نشاندہی کرنے کے باوجود امن عالم کی آرزو رکھنے والے افسانے3۔ جنگ بندی کے فوراً بعد پیدا ہونے والی افسردگی اور تلخی کے مظہر افسانے۔

اس سلسلے میں ہمارے افسانہ نگار نے عام طور پر سطحیت سے کام لیا،جس کی وجہ سے بیشتر افسانے جذباتیت کی فضا کے تحلیل ہوتے ہی حافظے کی نظروں سے اوجھل ہوگئے،البتہ ۱۹۷۱ء کے دسمبر تک صورت حال میں بہت بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔اس میں شک نہیں کہ شخصی حکومت کے تابع ذرائع ابلاغ نے عوام کو بے خبر رکھنے کی پوری کوشش کی مگر چھٹے عشرے کے آخری برسوں میں ہی مسعود اشعر اور غلام محمد کے ایسے افسانے شائع ہوئے جن میں اس المیے کے سائے موجود تھے جس نے بعد میں مغربی پاکستان میں بسنے والوں کو ششدر کر دیا۔ بہرطور اس المیے پر تین طرح کا افسانہ لکھا گیا:

1۔ ہیئت حاکمہ یا اسٹیبلشمنٹ کے سرکاری مقاصد کی تکمیل کرنے والے افسانے۔

2۔ محض بہاریوں کی مظلومیت کو نمایاں کرنے والے اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد ’ہجرت در ہجرت‘‘ کے ان کے المناک تجربے سے وابستہ افسانے۔

3۔ ان عوام اور اسباب کا احساس دلانے والے افسانے جنہوں نے پاکستان کو دولخت کیا۔

گزشتہ چند برسوں میں اردو افسانے میں ’جلاوطنی‘ کا احساس ابھرا ہے۔ بلاشبہ اسی کا قوی محرک تو معاشی اسباب کی بنیاد پر نقل مکانی ہے۔ یورپ امریکہ اور کینیڈا کے ساتھ ساتھ مشرقِ وسطیٰ، دیکھتے ہی دیکھتے پاکستانیوں کے لئے کوہ ندا کا درجہ اختیار کر گئے وہاں سے مسلسل بلاوا آ رہا تھا اور پاکستانی بے اختیار کھنچے چلے جا رہے تھے۔(بعض اوقات بلاوا بھی نہیں آتا، مگر کھنچے چلے جانے والے اسی صدا کے فریب میں مبتلا رہتے ہیں) اس صورتحال کے نفسیاتی، سیاسی اور سماجی اسباب ہیں۔ احساسِ شرکت سے محروم پاکستانی اپنے اجتماعی وجود کے بارے میں سوچنے اور اس کا اظہار کرنے کا حق نہیں رکھتے اس طرح ہجرت سے بھی زیادہ پیچیدہ اور المناک احساس نے جنم لیا، یہ بے گھری کا مسئلہ نہیں، گھر میں رہ کر بے گھری اور وطن میں بستے ہوئے جلاوطنی کا معاملہ ہے۔ مشرقِ وسطیٰ اور دیگر بیرونی ممالک میں مقیم پاکستانی جو روپیہ اندرونِ ملک بھیجتے ہیں اس سے زرمبادلہ کے ذخائر کتنے بڑھتے ہیں اور افراط زری میں کتنا اضافہ ہوتا ہے۔اس کا اندازہ تو ہر وزیر خزانہ کی بجٹ تقریر سے ہو جاتا ہے،مگر اس کے نتیجے میں ہمارے اخلاقی اور سماجی ڈھانچے اپنی قدروں کو جس طوفان کا سامنا ہے اس کی خبر ہمارا افسانہ دے رہا ہے۔آج پاکستان حسب سابق اپنی تاریخ کے ایک نازک دور سے گزر رہا ہے۔ ہماری تمام سرحدیں ناموافقت بلکہ عناد کے

قبضے میں ہیں۔عوامی تائید کے بغیر سماجی، سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے کو بدلنے کی کوششیں تو ہو رہی ہیں سیاست کی دنیا میں پاکستانی عوام کو نصف صدی تک فریب میں مبتلا رکھنے والے نعروں کو حاکموں کی جانب سے بے معنی قرار دیا جا رہا ہے۔اخلاقی بحران اپنے عروج پر ہے اور غیر یقینی حالات کی گھنٹی مسلسل بج رہی ہے، سنگ دل دانشور، امریکی تھنک ٹینکوں کی عینک لگا کر سقوطِ مشرق پاکستان سے ممثال المیے کی پیش گوئی کر رہے ہیں مگر پاکستانی قوم کا احساس اور ضمیر افسانے کے پردے پر مزاحمت کا نیا انداز پیش کر رہا ہے۔آج کا کم وبیش ہر قابل ذکر افسانہ نگار اسی موضوع سے متعلق بڑی بے باکی سے افسانہ لکھ رہا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ اب پاکستانی ادیب بے خبر اور بے بسی کے اس دائرے سے نکل آئے ہیں جس میں اسیر رہ کر انہوں نے المیہ مشرقی پاکستان کا نظارہ کیا تھا۔

اس مختصر سی عمر میں اُردو افسانے نے کیا نہیں دیکھا، آشوب زیست کا کون سا ذائقہ نہیں چکھا اور جبر و استحصال کے کس حربے کا مشاہدہ نہیں کیا؟ اس لئے میرے خیال میں مختصر افسانہ ادب کی تمام اصناف پر اس لئے فوقیت رکھتا ہے کہ اس میں ہماری قومی تاریخ کی ایک دستاویز بننے کی اہلیت بھی ہے اور فنی رچاؤ کے وہ تمام انداز بھی جو کسی صنف ادب کو 'قلیل المیعاد' بننے سے بچا لیتے ہیں۔

خود افسانہ نگار بننے سے پہلے شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا تھا جس صنف کی عمر ابھی آپ کے یہاں مشکل سے ستر پچھتر سال ہو اس میں کسی عظیم تحریر کا امکان زیادہ نہیں ہو سکتا۔یہ حقیقت ہے کہ اس مختصر عمر کو روایتی پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔۲۰ویں صدی تو ویسے بھی اس اعتبار سے قیامت کی صدی تھی کہ اس کا ہر پل، ہر گھڑی آگہی کے نئے منظر کو پیدا کرتا رہا اور ایک جہانِ حیرت ہے جو اکیسویں صدی میں بھی جلوہ نما ہے مگر اتنے بہت سے فلسفیوں، پیمبروں، کتابوں، سیاسی نظریوں، تہذیبی قرینوں کے باوجود دنیا مین حیوانی جبلتوں اور انسانی اقدار کے مابین، نام نہاد اشرافیہ اور ذلت کے مارے لوگوں کے مابین ایک جدل جاری ہے جس میں اب سرمایہ دارانہ نظام کا سب سے بڑا حربہ روبہ عمل ہے، گلوبیت کے نام پر جس کا دعویٰ ہے کہ انسانوں کے مابین ہر طرح کی تفریق مٹائی جا سکتی ہے۔زبان، نسل، قوم، علاقہ، یا کوئی اور حوالہ جو انسانوں کو تقسیم کرتا ہو۔قوموں کو تقسیم کرتا ہو۔سب بے معنی ہو رہا ہے مگر یہ دعویٰ دار دنیا کو اسی طرح تقسیم کئے ہوئے ہیں، ایک دنیا زرداروں کی ہے جو پروڈیوسرز ہیں اور دوسری دنیا بے زروں کی ہے۔جو صارف ہیں لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی محافظ قوتیں اپنی مرضی کی دنیا بغیر رکاوٹ یا مزاحمت کے تشکیل نہیں دے سکتیں۔اس کے متوازی تخلیق کاروں کا ایک ڈسکورس ہے جو دنیا کو ایک گاؤں بنانے والوں کو اس طرف متوجہ کر رہا ہے کہ اس گاؤں کی ضرورت تازہ ہوا، روشنی اور پانی کیساتھ وہ پرندہ بھی ہے جو فنون لطف اور تخلیقی عمل کا اعتبار قائم رکھتا ہے۔

جب تک ویت نامی، الجزائری، فلسطینی، امریکی یا یورپی سامراج سے لڑ رہے تھے، مزاحمت کا یہ منظر نامہ بڑا رومانوی اور قابل فہم تھا۔پھر روسی افواج افغانستان میں داخل ہوئیں، سرد جنگ کے 'نظریاتی محافظوں' کو اپنے ڈالروں، ہتھیاروں، منشیات، منی لانڈرنگ اور کٹھ پتلیوں کی مدد سے کمیونزم بمقابلہ اسلام منظر نامے کو خوں ریز اور

اپنے حساب سے نتیجہ خیز بنانے کا موقع ملا۔ سعودی عرب، کویت، قطر اور متحدہ عرب امارات نے فنڈ اور مقدس جبے بھی فراہم کئے، چیچنیا، اور ازبکستان سے 'باغی' دریافت کئے گئے، انہیں حجاز مقدس میں لے جا کر عمرے کرائے گئے، پاکستان کے سرحدی علاقوں میں انہیں مناکحت کے ایک سے زیادہ مواقع دیئے گئے۔ نسیم حجازی کے ناولوں کے شوقین جرنیل (جیسے حمید گل) امیر المومنین ضیاء الحق اور ملا عمر کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے اغیار کے لئے معرکہ جہاد میں مصروف ہوگئے۔ اس جہاد میں جان دینے والوں کے یتیم بچوں کے لئے امریکی امداد سے ایسے مدرسوں کا جال بچھا کہ خودکش بمبار اور خانہ سوز قسم کے سرفروش صرف پاکستان نہیں عالم اسلام کے نصیب میں آئے، جہاں شعیہ سنی معرکہ جو صدیوں سے جاری تھا اب اسلحہ سازوں اور ان کے تاجروں نے ایران، عرب، عراق، ترکی، شام کے مابین اختلافات کو ہوا دی اور پھر غلغلہ ہوا کہ روس ٹوٹ گیا ہے، کفرستان کا مرکز منہدم ہوا، پھر گیارہ ستمبر کا واقعہ ہوا، جس کے اصل کردار، محرکات اور اہداف ابھی تک پردہ اسرار میں ہیں، بہرطور پاکستان ایک میدان جنگ بن گیا۔ یوں پاکستان سے متصل افغانستان میں امریکی اور نیٹو افواج کی موجودگی، القاعدہ، داعش اور طالبان کی انسانیت پالیسی، بھارت میں سیکولر قوتوں کی پسپائی کے بعد امریکہ اور بھارت کا 'فکری اتحاد' ہوس زر میں مبتلا حکمران طبقات اور بے مہار ''غیر ریاستی'' اداروں کی مہم جوئی نے ایٹمی جنگ کے خدشے کو تقریباً ترک کر دیا ہے۔ ایسے میں افسانے میں شکستِ خواب، بے بسی اور مغائرت کا منظر چھا گیا، ترک وطن کے رجحان کو تقویت ملی ہے۔ تاہم متوسط طبقے کے ادیب کو بھی بیرون ملک سیاحت اور قیام کے مواقع ملے ہیں، معلومات، کتب اور مشاہدے کی مثیل ڈاکو مینٹری کی افراط نے تخلیق کار کوئی موقع بھی دیئے ہیں ان میں سے کچھ کے ہاں اپنی دھرتی، ثقافت اور لوک روایت کے ساتھ رومانوی ربط بھی پیدا ہوا ہے۔ اور بیشتر صورتوں میں افسانہ نگاری کی ذات اور نظر میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ مگر عظیم تخلیقی تجربے کا متبادلہ کوئی نہیں، وہ چاہے قریہ جاں کا معدوم ہو جانا ہی کیوں نہ ہو، جسے آپ نیر مسعود کی طرح اپنے تخیل سے بازیاب کرتے رہتے ہیں، یا پھر حسن منظر کی طرح اپنی دنیا جہاں کی مسافت اور تجربے کے بعد اپنے ہاں کے آدمی کے احوال اور شب و روز کے دل آویز بنانیے لکھتے جاتے ہیں۔

گزشتہ ایک عشرے میں اردو کے جو بڑے افسانہ نگار اس دنیا سے رخصت ہوئے ان میں نیر مسعود، انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، قرۃ العین حیدر، ابوالفضل صدیقی، آغا بابر، شوکت صدیقی، ہاجرہ مسرور، بانو قدسیہ، محمد خالد اختر، حجاب امتیاز، صادق حسین، محمد منشیاد، احمد جاوید اور سریندر پرکاش شامل ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے سولہ (۱۶) افسانوی مجموعے شائع ہوئے ان کا آخری مجموعہ 'کوہ پیا' تھا جو ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا، اور بعد کے برسوں میں ان کے چار افسانے شائع ہوئے جن میں سے ایک کے نیچے یہ نوٹ دیا گیا ہے ''اس ناول کا پہلا باب جو ارادے کے باوجود لکھا نہ جا سکا' گویا گزشتہ دس برس کے پاکستانی افسانے کے منظرنامے پر نظر ڈالیں تو احمد ندیم قاسمی ایک اندازِ فکر اور اسلوب فن کے طور پر موجود تو تھے مگر ادبی حلقوں میں ان کی گونجنے والی کہانیاں 'سناٹا' (۱۹۵۲ء) اور زیادہ سے زیادہ 'بازارِ حیات' (۱۹۵۹ء) کے بعد دوبارہ تخلیق نہ ہو سکیں، اس لیے پاکستانی افسانے کے منظر سے

رخصت ہونے والوں میں صرف انتظار حسین، اشفاق احمد، منشا یاد، احمد جاوید ہی آخر وقت تک بڑی کہانیاں تخلیق کرتے رہے اشفاق کی تخلیقی سرشاری اور شادابی کا تو یہ عالم تھا کہ سائنس فکشن کو اخلاقیات سے ہم آہنگ کرنے والے مجموعے 'طلسم ہوش افزا' (۲۰۰۰) کے بعد بھی ان کے دو افسانوی مجموعے ایک ہی بولی (پھلکاری) اور 'صبحانے افسانے' شائع ہوئے یہ اور بات کہ جب ان کی وفات کے بعد ان کی خودنوشت یا مجموعہ ملفوظات 'بابا صاحبا' شائع ہوا تو اندازہ ہوا کہ اس کتاب کے اجزا افسانوں کے طور پر بھی شائع ہو چکے تھے۔ دراصل اشفاق احمد بے حد طاقتور متکلم تھا وراس کے پاس اپنے علم اور مشاہدے کو کسی مخصوص نظریے میں ڈھالنے کی صلاحیت تھی۔ وہ انسانی روح اور دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں اترنے کی صلاحیت رکھتا تھا عام اور سادہ سے مرکب اور تہہ دار صورتِ حال پیدا کرنا جانتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے پاس اظہار کی غیر معمولی صلاحیت تھی، پنجابی کے روزمرے محاورے لوک دانش اور شعروادب کے اعلیٰ ترین نمونوں کا ذائقہ اس کی زبان میں رچ بس گیا تھا مگر اس کا متصوفانہ رویہ اتنا بے ساختہ بھی نہیں تھا اور اکثر جابر حکمرانوں کے کام بھی آ جاتا تھا، اسی طرح قرۃالعین حیدر کی صورت میں ایک عظیم افسانہ نگار، اپنی زندگی کے آخر تک لکھتی رہی ہیں اوران کا نام ایک تصورِحیات، زاویہ فن اور قرینہ اظہارے کے طور پر پہچانا چاہتا ہے موجودہ منظر پر نگاہ ڈالیں تو اسد محمد خان، رشید امجد، حسن منظر، سلام بن رزاق، خالدہ حسین، مسعود اشعر، زاہدہ اور فہمیدہ ریاض کے ساتھ آصف فرخی، ڈاکٹر شیر شاہ سید، ڈاکٹر انور زاہدی، نیلم احمد بشیر اور طاہرہ اقبال اردو افسانے کے دامن کو فکری، فنی، ہیئتی اور لسانی تنوعات عطا کر رہے ہیں۔

حواشی:

۱۔ خالدہ حسین، جینے کی پابندی، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز: ۲۰۱۸ء)، ص:۱

۲۔ اصغر ندیم سید، کہانی مجھے ملی، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز: ۲۰۱۸ء)، ص:۶۲

۳۔ قاضی افضال، صغیر افراہیب (مرتب) سارک ممالک میں معاصر افسانہ، (علی گڑھ: یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء)، ص:۱۵

۴۔ ناصر عباس نیر، فرشتہ نہیں آیا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز: ۲۰۱۷ء، ص:۱۱۲

مآخذ:

۱۔ اصغر ندیم سید، کہانی مجھے ملی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز: ۲۰۱۸ء

۲۔ خالدہ حسین، جینے کی پابندی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز: ۲۰۱۸ء

۳۔ قاضی افضال، صغیر افراہیب (مرتب) سارک ممالک میں معاصر افسانہ، علی گڑھ: یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء

۴۔ ناصر عباس نیر، فرشتہ نہیں آیا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز: ۲۰۱۷ء